ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

ماخذ تحقیقی مجلہ

محمد سلیمان
لیکچرر شعبۂ اُردو اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور
ڈاکٹر بادشاہ منیر
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ ءاردو پشاور یونیورسٹی

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "فالتو" میں ماں کے کردار کا نفسیاتی جائزہ

Muhammad Sulaiman
Lecturer Department of Urdu Islamia College University Peshawar.
Dr. Badsha Munir
Associate professor Department of Urdu University of Peshawar.

Psychological review of the role of Mother in Ahmad Nadeem Qasmi Short Story "Falto"

Ahmad Nadeem Qasmi was simultaneously a great poet, novelist, columnist, critic and intellectual. He was a progressive writer and a believer in literature for life. Like Prem Chand most of his themes and characters reflect rural life and society,. His fiction is full of variety, breadth and variety of themes. He was a philanthropist and a believer in human dignity. The most oppressed and miserable class among them is the woman who is being exploited by various tricks and excuses. In the myth "Faaltoo" there is a character of a mother who is left alone despite giving her son unconditional love. If she does not get the love she was looking for in her son and daughter-in-law, then she prefers death to a life of humiliation.

Key Words: *Ahmad Nadeem Qasmi, Character, Psychology, Suicide.*

جس طرح پریم چند نے دیہاتی زندگی کی روایات، رواجات، مسائل اور سماجی رویوں کو اپنی کہانیوں میں بیان کیا۔ اسی طرح احمد ندیم قاسمی نے بھی اپنے افسانوں میں دیہات کی زندگی کے زیر و بم کی مصوری کی ہے۔ قاسمی صاحب کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جو خود دیہاتی ہیں۔ ان کی حساس طبع نے انہیں اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات کا غائر مطالعہ کرنے پر مجبور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں دیہی زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشے کو بے نقاب کرتی ہیں۔ در حقیقت احمد ندیم قاسمی قومی معاشرتی اصلاح کا جذبہ رکھنے والے اور انسان دوست فنکار تھے۔ انہوں نے انسان کو انسانی مسائل کو قریب سے دیکھا اور عمیق مشاہدہ کیا۔ پھر ان مشاہدات و تجربات کو فن کے قالب

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

میں ڈھال کر پُر تاثیر بنایا۔ انہوں نے اپنے گرد و پیش میں پائی جانے والی ہر بُرائی، ظلم اور ناانصافی کو اپنے قلم کی نوک سے ملامت کیا۔ انہوں نے دیہاتی آبادی کے غریبوں، محتاجوں اور مظلوموں کی بصورت افسانہ دادرسی کی۔ قاسمی صاحب انسانی فطرت کے پیچ و خم سے واقف قلم کار ہے۔ وہ زندگی کی سفاک حقیقتوں پر پردہ نہیں ڈالتے بلکہ انسان کے تمام باطنی و خارجی محرکات کو اپنے اصلی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین لکھتی ہیں:

> انسانی فطرت کا گہرا اور قریبی مطالعہ فنکار کے لئے لازمی شے ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں انسانی نفسیات کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ قاسمی صاحب کے تمام افسانوی تجرباب اپنی مٹی، تہذیب، روایت، تجربے اور جڑ سے جڑے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے ماضی کی روایت، حاصل کے تقاضوں اور مستقبل کے امکانات سے مزین دکھائی دیتے ہیں۔[۱]

احمد ندیم قاسمی ماحول، موضوعات اور کرداروں کے حوالے سے محدود افسانہ نگار نہیں تھے۔ انہوں نے جہاں دیہاتی عناصر کو اپنی کہانیوں میں بیان کیا وہاں شہر کی غلاظتوں اور منافقتوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ جہاں ان کی نظر سیاسی و سماجی تبدیلیوں، فسادات، قحطِ بنگال اور جنگوں سے پھوٹنے والے ابتر حالات پر تھی وہاں ان کی عقابی نگاہیں عالمی حالات و واقعات بالخصوص مارکس، فرائیڈ اور ژونگ کے نظریات پر بھی مرکوز رہیں۔

دراصل احمد ندیم قاسمی انسان دوستی اور انسانی عظمت کے گُن گانے والے کا فنکار تھے۔ وہ جب بھی سماج پر تنقید کرتے ہیں یا ظلم و جبر اور ناانصافی پر احتجاجی رویہ اپناتے ہیں تو یہ ان کی انسان دوستی کی دین ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> " انسان دوستی اس کا فنی آدرش ہی نہیں، مقصد حیات بھی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جب وہ انسان کو غیر انسانی حالت میں دیکھتے ہیں تو ان کے اندر حساس فنکار تخلیقی سطح پر احتجاج کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔"[۲]

قاسمی صاحب مجوس زندگیوں اور حالات کے جبر کا شکار بننے والے بے زبان لوگوں کے قصے لکھتا ہے اور اُن بے جا روایات، اقدار اور سماجی و خاندانی رویّوں کو بے رحمی سے آشکارہ کرتے ہیں۔ جن کی بدولت سادہ لوح انسان کی زندگی تباہی کی نذر ہو جاتی ہے۔

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

افسانہ "فالتو" کی کہانی ایک ایسے خاندان کے گرد گھومتی ہے جہاں بہو کے گھر میں آنے کے ساتھ ہی جھگڑوں اور تنازعات کا دور شروع ہو جاتا ہے۔

پیر بخش کئی زمینوں کا مالک تھا۔ وہ خود کھیتی باڑی کرتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے حبیب احمد کے لیے کپڑے کی دکان کھول لیتا ہے۔ کچھ ہی سالوں میں اُس کی دُکان چمک اُٹھتی ہے اور اتنا منافع کما لیتا ہے کہ اپنے علاقوں کے رئیسوں میں شمار ہونے لگتا ہے۔ گاؤں میں نام اور ٹھاٹ بڑھنے کے ساتھ ہی ایک امیر باپ کی بیٹی سے رشتہ طے ہو جاتا ہے۔ شادی کے کچھ ہی دن بعد جب اس کی ماں صفائی کر رہی تھی تو نادانستہ ایک رکابی اور گلاس توڑ بیٹھتی ہے۔ اس پر ساس بہو میں تُو تکار ہو جاتی ہے تو ماں (نیک بخت) شوہر (پیر بخش) کو ساتھ لے کر گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ اور دونوں اپنے کھیتوں کے ایک کونے میں ڈھیری پر بنائے گئے کچے مکان میں رہنے لگتے ہیں۔ اُن کا بیٹا حبیب احمد اُس کی منت سماجت کرتا ہے۔ گاؤں کے بُزرگ وہ معتبر لوگ اور سمدھی اُسے واپس گھر جانے کی گزارش کرتے ہیں۔ لیکن وہ نہ خود جاتی ہے اور نہ اپنے بوڑھے شوہر کو جانے کی اجازت دیتی ہے۔ ایک دن شدید بیمار ہو گئی اور کچھ دنوں بعد دنیا سے رخصت ہو گئی۔

نیک بخت عرف نیکاں کے حوالے سے دو سوالات ابھرتے ہیں پہلا یہ کہ وہ اتنی معمولی سی بات پر اتنی لمبی اور پکی ناراضگی کیوں اپنا لیتی ہے نہ صرف خود کو موسموں کی سختیوں کی نذر کرتی ہے بلکہ اپنے بوڑھے شوہر کو بھی ذلیل و خوار کرتی ہے۔ پھر سب کی التجا کرنے اور منانے کے باوجود بھی اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کرتی۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی انمول اور قیمتی زندگی کو موت کے بے رحم پنجوں میں دے دیتی ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ اُس کی یہ موت، طبعی موت تصور ہو گی یا یہ خود کشی ہو گی۔ ان دونوں سوالات کے جوابات میں کُودنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسا جائزہ لیا جائے جس میں متوسط اور ادنیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکی کے بچپن سے لے کر ماں اور ساس بننے تک کا ارتقائی سفر ہو۔

مشرقی معاشرے بالخصوص دیہات میں عموماً لڑکی کی پیدائش پر بُری صورت بنا کر مُنہ بسور لیے جاتے ہیں۔ اسے وہ لاڈ پیار اور توجہ نہیں ملتی، جو اس کے بھائی کو حاصل ہوتی ہے۔ گھر میں اس کا درجہ، حیثیت اور مقام برائے نام ہوتا ہے۔ اگرچہ ماں کی مامتا اس پر مہربان ہوتی ہے۔ باپ کی شفقت اور بھائیوں کی محبتوں سے بھی ہم کنار ہوتی ہے۔ لیکن اس کی حیثیت پھر بھی منفی ہی ہوتی ہے۔ وہ سب سے تھوڑی بہت توجہ اور محبت بٹورنے کے باوجود بھی خود کو قید میں محسوس کرتی ہے۔ کیونکہ خاندان نے اس کے لیے کچھ تہذیبی پیمانے اور ادبی حدود و دائرے مقرر

کیے ہوتے ہیں۔ جن سے روگردانی کرنے اور انہیں پھلانگنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی۔ خاندان کے ہر فرد کی غضبناک اور کھا جانے والی نگاہیں دن رات اس کا پیچھا کرتی ہیں۔ خصوصاً بڑی بوڑھیاں اس کی چڑھتی جوانی اور امنگوں پر ناگن بن کے پہرے دیتی ہیں۔ اسے بات بات پر ٹوکتی اور خبردار کرتی رہتی ہیں لڑکی بیچاری مورچے کے جیسے کٹھن حالات سے گزر رہی ہوتی ہے۔ وہ نہ تو کھلکھلا کر زور سے ہنس سکتی ہے اور نہ بھولے سے سر سے آنچل سرک سکتا ہے۔ وہ پاؤں جھٹک جھٹک کر نہیں چل سکتی۔ وہ ہمیشہ پردہ کی اوٹ سے بولتی ہے۔ تصنع اور بناوٹ کی بولی پر اسے سختی سے ملامت کیا جاتا ہے۔ وہ خاندان کی ناک تصور ہوتی ہے۔ والدین، بھائی اور بڑی بوڑھیوں کے ترچھے تیور، خشمگیں نگاہیں، اور چُبھتے الفاظ اُسے ہر سمے یہ یاد دلاتے رہتے ہیں کہ نظروں میں حیااور آواز میں نرمی ہو، اجنبی مردوں سے بے اعتنائی اور حجاب ہو، شرم وحیا سے رخسار پر شفق کی سُرخی ہو۔

المختصر لڑکی کے لیے بچپن سے جوانی تک کا یہ دور بڑا کٹھن اور صبر آزما ہوتا ہے۔ اس دوران وہ قید وبند کی سختیاں جھیلتی ہیں، محرومیاں پالتی ہیں۔ چونکہ وہ ایک گھٹن زدہ اور پابند ماحول میں زندگی جی رہی ہوتی ہے اس لئے بعض اوقات اُسے اپنا وجود ناکارہ اور ہیچ مکارہ نظر آتا ہے۔ بعض اوقات وہ خود کو خاندان اور دھرتی پر اضافی بوجھ سمجھنے لگتی ہے۔ اس گھٹن زدہ ماحول میں وہ ایک امید لے کر آگے بڑھتی ہے۔ اُس کی اُمیدوں اور خواہشات کا واحد دروازہ "شادی" ہوتا ہے۔ شادی اس کے لاشعور کی ایک بڑی خواہش یایُوں سمجھیئے کہ ایک دیرینہ اور سہانا خواب ہوتا ہے۔ اسی امید کی آغوش میں اس کے تمام جبلّی تقاضے اور برسوں سے دبی چلی آرہی نفسانی و جنسی خواہشات راحت پاتی ہیں۔ شادی سے جہاں اُسے قلبی سکون ملتا ہے وہاں وہ اعصابی و ذہنی لحاظ سے پختگی و بلوغ کا احساس پاتی ہے۔ شادی ہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جس کے بعد وہ خود کو مکمل عورت کی صورت میں دیکھتی ہے۔ خود اعتماد بن کے خود داری اور سنجیدگی سے سماجی فرائض نبھانا شروع کر لیتی ہے۔ بُردبادی اور خود اعتمادی اُس وقت عروج پر پہنچتی ہے جب وہ اللہ کے فضل سے تخلیقی کمال کا مظاہرہ کرتے ہوئے بچہ جنتی ہے اور ماں بنتی ہے۔ یہی وہ تخلیقی جوہر ہے جس سے وہ معاشرے کی بہتر تعمیر و تشکیل میں عملی کردار ادا کر کے حصہ لیتی ہے۔

ماں کو اپنے جگر گوشے سے لازوال محبت اور بے پناہ لگاؤ ہوتا ہے۔ وہ اس بچے کو اپنے اُن معصوم اور بے ضرر خوابوں کی تعبیر سمجھتی ہیں جو اُس نے عالم جوانی میں دیکھے تھے۔ یہ بچہ اُس کے نسوانی پندار اور نسائی غرور کا منتہائے کمال ہوتا ہے، یہ اُس کی ساری اُمیدوں اور مسرتوں کا منبع ہوتا ہے۔ اسے وہ اپنے ماضی کی مایوسیوں، محرومیوں اور ناکامیوں کی تلافی سمجھتی ہے، اسے حال کا وسیلہ اور مستقبل کے تاریک راستوں کے لیے تابانی اور سہارا

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

سمجھتی ہے۔ وہ بچہ کے وجود کو اپنے تن کا ایک ٹکڑا سمجھتی ہے۔ وہ بچہ میں اپنی ذات کی جھلک اور شخصیت دیکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بعض اوقات اس اُلفت اور جذباتی لگاؤ میں اس قدر آگے نکل جاتی ہے کہ اس محبت میں کسی دوسرے کی شرکت تو کیا، بچہ کے باپ کو بھی دور دھکیلنے کی لاشعوری کوشش کرتی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> "ماں کا بچے سے پیار اس قدر گھمبیر ہوتا ہے کہ وہ اس کی بلا شرکت غیرے مالک بننا چاہتی ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتی کہ اس پیار میں کوئی اور حتیٰ کہ بچے کا باپ بھی شرکت کر سکے۔ ویسے یہ عورت کی فطرت کا ایک اہم اور دلچسپ پہلو ہے کہ عورت ہر معاملہ میں لاشریک رہنا چاہتی ہے۔ اپنے محبوب یا شوہر کی محبت سے لے کر گڑیوں تک وہ کسی معاملہ میں بھی کسی کی شرکت گوارہ نہیں کر سکتی۔ وہ یہی چاہتی ہے کہ وہ ہر چیز کی تنہا مالک ہو"۔ (۳)

دراصل ماں بچہ کو اپنی گرفت میں لینا چاہتی ہے۔ وہ اسے کسی کے ساتھ تقسیم نہیں کر سکتی۔ اسے وہ اپنی محبت اور ذات تک محدود رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن یہ سب ممکن نہیں ہوتا۔ کیونکہ جتنا حق اُسے اپنے بیٹے پر ہے، اُتنا ہی حقدار اُس کا باپ ہے۔ اُس وقت عجیب صورتحال پیدا ہو جاتی ہے جب باپ بچہ کے قریب جاتا ہے تو ماں کی لاشعوری خواہشات و محرکات بیدار و مضطرب ہو کر میدان عمل میں آتے ہیں۔ جن سے وہ خود بھی ناشناس ہوتی ہے۔ وہ لاشعوری طور پر بچہ کے دل میں باپ کے لیے نفرت اور دشمنی پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور اس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوتی ہے۔

ہوتا یوں ہے کہ جب ماں کا لاڈلا کوئی شرارت کر لیتا ہے یا اُس سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو وہ خود ڈانٹنے، سرزنش کرنے یا سزا دینے سے گریز کرتی ہے۔ ایسی حالتوں میں وہ اکثر باپ کی دلیری اور احساس مردمی کو جگا کر اس کے جاہ و جلال کو دعوت دے کر کہتی ہے، "دیکھیں نہ بچہ کتنا تنگ کر رہا ہے۔" یا گویا ہوتی ہے کہ، "خدا کے لئے اس کا کچھ کرو ورنہ میں تو اس کے آگے عاجز ہوں۔" اور لطف کی بات یہ ہے کہ باپ کی غیر موجودگی میں بھی وہ بیٹے کو باپ سے متنفر کرنے کی کوئی کسر نہیں چھوڑتی بلکہ باپ کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اسے ایک بلا یا خوفناک فلموں کے خونخوار کردار کے طور پر پیش کر دیتی ہے۔ کہتی ہے، "آجانے دو تمہارے ابّا کو، ان سے چاقو اور ڈنڈے سے تمہیں ٹھیک نہ کرایا تو کہنا۔"

ممتاز مفتی اس حوالے سے اپنی کتاب "تلاش" میں لکھتے ہیں:

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

"ماں کی Lust of Pessession اس قدر شدید ہے کہ وہ "نہیں چاہتی کہ بچے باپ کے قریب ہوں، اس لیے اگر باپ کے قریب ہو گئے تو ماں سے دور ہو جائیں گے۔ اس لئے وہ ایسا طریق کار اپناتی ہے کہ بچے باپ سے ڈریں، اس کے قریب نہ جائیں۔ ہمارے معاشرے میں ماں بچوں کو باپ سے ڈراتی رہتی ہے۔ "نہ نہ نہ۔ ایسا نہ کرو بیٹا۔ اگر ابّا کو پتہ چل گیا تو پٹ جاؤ گے۔"۔۔۔۔۔۔ "میں تیرے ابّو کو بتا دوں گی کہ تو نے اس روز جھوٹ بولا تھا۔" خاموش! ابّو آرہے ہیں"۔۔۔۔۔۔۔ بچے سمجھتے ہیں کہ جھوٹ بولنا بُرا نہیں۔ بس ابّو کو پتہ نہ چلے۔ ماں کے سامنے چاہے دنگا فساد کرو لیکن ابّو کے سامنے نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے سمجھتے ہیں کہ باقی سب ٹھیک ہے لیکن ابّو بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ ماں بچوں کو خبر دار کرتی رہتی ہے کہ ابّو کا احترام لازم ہے وہ یہ کبھی نہیں کہتی کہ میرا احترام کرو۔ مجھ سے ڈرو۔ وہ بچوں کے دلوں میں اپنے لیے محبت کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور باپ کے لیے خوف کا۔"(۴)

ایسے موقعوں اور حالتوں میں ماں اپنے لاشعوری محرکات اور کوششوں کی زد میں آکر ایک تیر سے دو شکار کرتی ہے۔ ایک جانب شوہر کو یہ احساس دلا رہی ہوتی ہے کہ تم ہی خاندان کے ان داتا اور گھر کے سیاہ و سفید کے مالک ہو۔ تو شوہر کے دل میں یہ خوش کُن خیال یا خوش فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ بچے نے سارے گھر کو سر پر اٹھا رکھا ہے اور اپنی شرارتوں اور شیطانیوں سے ماں کی ناک میں دم کر رکھا ہے۔ فقط اس کے جاہ و جلال اور غضبناک نگاہوں سے گھر امن و سکون کا گہوارہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ پھر وہ شعوری طور پر چہرے کے تیور تبدیل کرتا ہے اور لہجہ میں درشتی، خشونت اور غصّہ لاتا ہے۔

دوسری جانب بچہ ایک سائنسدان اور فلاسفر کی عمیق نگاہوں سے سب کچھ دیکھتا ہے، مشاہدہ کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ باپ ہی اُسے غلطیوں اور شرارتوں پر ڈانٹتا اور ملامت کرتا ہے۔ وہی اس کی خواہشات، مسرتوں اور لطائف کے حصول میں رُکاوٹ ہے۔ اس طرح وہ باپ کو اپنا مخالف سمجھ کر اُس سے بد ظن ہو جاتا ہے۔ یہ بد ظنی اور نفرت اُس وقت انتہا کو پہنچ جاتی ہے، جب میاں بیوی میں ناچاقی یا کوئی بد مزگی آجائے تو ماں کی سسکیاں اور اشک دیکھ کر وہ باپ کو ہی قابل الزام ٹھہراتا ہے۔ اس طرح بچہ باپ سے متنفر اور ماں کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے اور یہی ماں کی لاشعوری منزل ہوتی ہے۔

ایک دوسری کیفیت اس سے بھی زیادہ دلچسپ اور دل آویز ہوتی ہے۔ماں ہی وہ ہستی ہوتی ہے جو بچہ کو باپ خشمگیں نگاہوں اور چلتے ہاتھوں سے ڈراتی اور دھمکاتی ہے۔ماں ہی اپنے گلے شکووں سے اُسے باپ سے پٹواتی ہے۔جب بچہ باپ کے چلتے ہاتھوں کا ہدف بنتا ہے اور وہ درد سے چیخ اُٹھتا ہے تو ماں کی مامتا جوش میں آکر دیوانہ وار بچے کو چومتے اور پناہ دیتے ہوئے اپنے کو لہے میں بھر لیتی ہے۔اُس کے آنسو پونچھ کر اسے سہلاتی ہے۔یہ کسی بھی ماں کے لیے ایک آئیڈیل صورتحال ہوتی ہے۔اسی حالت میں ماں کی مامتا اور لاشعوری محرکات کو یہ سکون مل جاتا ہے کہ اب یہ بچہ کُلی طور پر اس کے تصرف میں آچکا ہے۔وہ یہ اطمینان پالیتی ہے کہ اسے اب کوئی مجھ سے جُدا نہیں کر سکتا۔ایسے جذباتی مواقع پر وہ اپنی محبت اور لاڈ پیار میں مزید سخاوت وہ کشادگی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ جس کا منفی تاثر یہ نکلتا ہے کہ بچہ خود کو ماں کی ہستی کا ایک انگ سمجھنے لگتا ہے۔یہی منفی تاثر اسے "ایڈی پس الجھاؤ" کا شکار بنا دیتا ہے۔ماں کی ایسی بے انتہا محبت اور حد درجہ لگاؤ، بچے کی شخصیت کی بہتر نشوونما اور صحت مند ارتقاء کے لیے مفرت رساں ثابت ہو سکتی ہے۔

بچے سے ماں کی محبت بڑی گھمبیر اور گہری ہوتی ہے۔بچے کی ولادت سے لے کر اُس کے عالم شباب تک ماں کی مامتا اور ماں کے لاشعوری جذبات واحساسات تسکین پاتے رہتے ہیں۔وہ بچہ کی محبت کسی کے ساتھ بھی تقسیم نہیں کر سکتی۔ لیکن تقسیم کے اس مرحلے کو تو ایک دن آنا ہی ہوتا ہے۔یہ مرحلہ اُس وقت آتا ہے جب بیٹے کی شادی خانہ آبادی کا وقت آجاتا ہے۔ماں بڑے چاؤ اور گرم جوشی سے اُس کی شادی کرتی ہے۔اُس کے عقدِ نکاح کی تقریب میں دل کے سارے ارمان نکال لیتی ہیں۔اپنے بیٹے اور بہو (دولہا اور دلہن) کی خانہ آبادی کے لیے سچے دل سے دعائیں بھی مانگتی ہیں، لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد اسی خانہ آبادی کو خانہ ویرانی پر کمربستہ ہو جاتی ہے۔یہ بھی ماں کی مامتا اور لاشعوری جزبات کی کارفرمائی ہوتی ہے۔اُس نے جس بیٹے کو خود سے کبھی جُدا نہ کیا حتیٰ کہ باپ کی شفقت سے بھی اسے محروم رکھا، اب وہ بڑی آسانی سے بیوی کی گود میں چلا گیا۔اُسے احساس ہو جاتا ہے کہ اب میرا بیٹا میری امیدوں اور توقعات کے مطابق وفا شعار نہیں رہا، اب وہ اپنا دُکھ سُکھ مجھے بتانے سے گریز کرنے لگا ہے، اب وہ تمام معاملوں اور ہر نوع کے حالات میں، میری رائے کو اہمیت اور احترام نہیں دیتا۔اس طرح وہ بیٹے سے بدظن ہو جاتی ہے۔

جبکہ تصویر کے دوسرے رخ کو دیکھا جائے تو بیٹا اب بچہ نہیں رہا، جوان ہو چکا ہے۔شادی کے بعد وہ ایک نئی اور خوشگوار دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ جہاں وہ صنف مخالف کے چاؤ چوچلوں اور مہکتی سانسوں کی تپش سے رومانوی

فضاؤں میں کھو چکا ہے۔ ساتھ ہی ایک ذمہ دار شخص بن کر اپنے فرائض کی عہدہ بر آئی کرتا ہے۔ اور ماں سمجھتی ہے کہ اب اس کا بیٹا وہ نہیں رہا۔ اب وہ اس پر جان نہیں چھڑکتا، اگر وہ مجھ سے متنفر نہیں تو بیزار اور لاپرواہ ضرور ہو چکا ہے۔ یہی باتیں اُسے اندر سے بھنبھوڑتی رہتی ہیں، مضطرب رکھتی ہیں۔ (بے چارے بیٹے کی حالت ایسے مقناطیس کی ہو جاتی ہے جسے دو طاقتور مقناطیس مخالف سمت میں اپنی جانب کھینچ رہی ہوں) ماں جب دیکھتی ہے کہ بیٹا اب ہر معاملے میں بیوی سے رجوع کرتا ہے تو اندر سے جل بھن جاتی ہے۔ وہ بہو کو کباب میں ہڈی سمجھتے ہوئے اُسے جا و بے جا اور موقع بے موقع کوستی اور ملامت کرتی ہے۔ اس خود غرضی میں وہ یہ بھول جاتی ہے کہ "ماں بیٹے کی الفت میں شبنم ایسی خنکی ہوتی ہے جبکہ میاں بیوی کی محبت میں شعلہ ایسی لپک اور گرمی پائی جاتی ہے لیکن ساس اگر ان باریکیوں پر غور کر سکتی تو چاہیے ہی کیا"۔ (۵)

ساس کا اپنی بہو سے بے پناہ چڑ اور ضد کی ایک نفسیاتی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ خود جوانی کی بہاروں سے گزر چکی ہوتی ہے یا دوسرے لفظوں میں وہ عمر خزاں میں جی رہی ہوتی ہے۔ جوانی کی دلربائی اور ترغیب انگیزی خود میں نہ پا کر عجیب محرومیوں اور احساس کمتریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ بہو کی نو شگفتہ و پُر شباب جوانی، عشوہ گری، جدید فیشن کے نئے اور اچھوتے ملبوسات اور ایک مخصوص انداز سے اٹھلا کر چلنے کا انداز، اس کا مُنہ چڑاتی ہیں۔ یہ اور ایسے تمام امور اسے محرومیوں، کمتری اور ذہنی انتشار کے سوا کچھ نہیں دیتیں۔ اُوپر کے جائزے کے تناظر میں نیک بخت عرف نیکاں کے کردار کو پرکھنے کی سعی کرتے ہیں۔ نیکاں کو اپنے اکلوتے بیٹے (حبیب احمد) سے بے پناہ لگاؤ اور محبت تھی۔ اُسے یقین کی حد تک توقع تھی کہ شادی کے بعد بھی بیٹا ویسا ہی وفادار اور تابع فرمان ہو گا جیسا شادی سے قبل تھا۔ لیکن اس کی توقعات پر پہلا معمولی سا وار اُس وقت ہوا جب نادانستگی میں اُس سے آبگینے کے برتن ٹوٹ گئے۔ تو بہو بلند آواز سے بولی، یہ تو میں میکے سے لائی تھیں۔ تو نیکاں فخر اور غرور کے ملے جلے انداز میں جواب دیتی ہے کہ:

> تیرے میکے کے ہیں تو میرے بیٹے کے بھی تو ہیں۔ "نیک بخت نے حبیب احمد کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔۔۔۔۔۔ حبیب احمد بولا "میرے بھی ہوتے تو نئے برتنوں کے ٹوٹنے کا رنج ہوتا ہی ہے۔۔۔۔۔ اور نیک بخت یوں نظر آنے لگی جیسے گلاس اور پلیٹ کے ساتھ وہ بھی ٹوٹ گئی ہے"۔ (۶)

ماں کو بیٹے سے اس نوع کے جواب کی ہرگز توقع نہ تھی۔ اس نے ناراضگی میں شوہر کو مجبور کیا کہ وہ قصبے سے اسی طرح کے دو برتن لائے۔ جب برتن لائے گئے تو نیکاں اُسے بہو کے پاس لے جا کر کہتی ہیں کہ:

"یہ لے بہو اپنا گلاس اور اپنی رکابی۔ تیرا میرا حساب ختم۔ نیک بخت بیٹے کی بجائے بہو کی طرف بڑھی مگر بہو کی بجائے بیٹا اُٹھا اور ماں کے ہاتھوں سے دونوں چیزیں چھین کر دیوار پر دے ماریں۔۔۔۔۔۔نیک بخت چکر کھا کر بیٹھ گئی"۔(۷)

بیٹے کا یہ عمل ماں کی مامتا کے لیے دوسرا بڑا دھچکا تھا۔ جسے وہ برداشت نہ کر سکی اور پانے بوڑھے ساجن کو ساتھ لے کر اپنی زمینوں کے کچے مکان میں ہمیشہ کے لیے چلی جاتی ہے۔ کسی کے کہنے پر بھی واپس گھر نہیں آتی اور آخر میں وہی پر کسی بیماری کی وجہ سے مر جاتی ہے۔

یہاں صاف دیکھا جا سکتا ہے کہ جس بیٹے کو اس نے لاڈ پیار سے پالا تھا اور سب کی نظروں سے چھپا کر رکھا تھا۔ جس کی محبت کو کسی کے ساتھ بھی تقسیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہی بیٹا اور اس کی محبت میں، بیوی حصہ دار بن کر آجاتی ہے۔ یہی شراکت داری اس کے لیے ناگوار بلکہ ناقابل برداشت بن جاتی ہے۔ ایک طرف اُسے یقین ہو گیا کہ میرا بیٹا، میرا نہیں رہا۔ دوسری طرف بہو کی نو شگفتہ جوانی، عشوہ گری اور ہرنی جیسی چال اُس کے بڑھاپے کو چڑا رہی ہے۔ ان اذیتوں، محرومیوں اور مایوسیوں سے پناہ لینے کے لئے وہ گھر کو ہمیشہ کیلئے خیر باد کہہ دیتی ہے۔

لیکن یہ بات ذہن کو ضرور کھٹکتی ہے کہ جب وہ گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے تو اتنی پکی چلی جاتی ہے کہ پھر گھر آنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ یہاں تک کہ مر جاتی ہے۔ اگرچہ وہ کسی بیماری کے کارن مری تھی لیکن قیاس کہتا ہے کہ اُس نے خودکشی کی تھی۔ دراصل وہ بیٹے کی بے وفائی پر شدید ڈی پریشن میں چلی گئی تھی۔ اسی ڈی پریشن نے اس کے دل و دماغ سے زندگی کی رمق ختم کر دی تھی۔ وہ مزید زندگی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے خود کو ذہنی طور پر موت کے لیے تیار کر لیا تھا۔ بلکہ وہ ایک نوع کی خودکشی کرنے جا رہی تھی۔ اس نوع کی خودکشی کا نام "اپنی موجودگی کے فلسفہ پر مبنی خودکشی Existential Sucide" ہے۔

"جب زندگی میں بوریت زیادہ ہو جائے اس میں ترقی و خوشحالی کے امکانات ختم ہونے لگیں۔ ہر شے بے معنی نظر آئے تو بعض لوگ موت کو زندگی پر ترجیح دینے لگتے ہیں۔۔۔۔۔۔خودکشی کے اس طریقہ کار میں دوسروں کو محض دھمکی دینا۔ ان کی توجہ اور ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کرنا بھی شامل ہے۔ اور ایک حوالے سے خود اپنی ذات کے لیے اذیت اور انتقام کی کیفیت بھی موجود ہے۔"(۸)

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

نیکاں کی موت کو خود کشی کے ایک اور حوالے سے دیکھتے ہیں۔ تقریباً تمام خود کشی کرنے والے افراد "شدت احساس" کے مالک ضرور ہوتے ہیں۔ وہ معمولی باتوں اور رنجشوں کو دل پر لیتے ہیں۔ عموماً ایسے افراد کے اعصاب انتہائی کمزور ہوتے ہیں۔ اپنے حساس پن کی وجہ سے ذرا سی ٹھیس انہیں ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ اسے ہر انسان اپنا رقیب اور دشمن نظر آتا ہے۔ ہر ہستی کو اپنی تحقیر اور ہر مسکراہٹ کو اپنے زخموں پر نمک پاشی تصور کرتے ہیں۔

نیکاں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ذکی الحس عورت تھی۔ وہ اپنی اُلفت میں شرکت اور عزت نفس کی تذلیل کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے وہ اس جگہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیتی ہے جہاں اس کے وجود اور جذبات کی نفی کا عَلم بلند ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی انا اور غیرت کی پاسداری میں موت کو گلے لگا لیتی ہے مگر گھر نہیں جاتی۔

نیکا کی خود کشی کو ایک اور حوالے سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شاید وہ اپنے بیٹے سے اپنی بے توجہی اور بے قدری کا انتقام لے رہی ہے۔ اس لیے کہ جب وہ گھر چھوڑ کر جا رہی تھی تو راستے میں مزارعے اس سے گھر چھوڑ کر جانے کا سبب دریافت کرتا ہے تو وہ بتاتی ہے:

> "ہم سے کیوں پوچھتے ہو جاؤ جُبے سے پوچھو جس نے ماں باپ کو بیچ کر بیوی خریدی ہے"۔[۹]

اور جب بیٹا خود اُسے منانے اور لینے جاتا ہے تو وہ اس سے کہتی ہے کہ

> "تیری عزت! اور کیا ہماری کوئی عزت نہیں ہے؟ کیا اپنی عمر بھر کی کمائی کی طرح ہم نے اپنی عزت بھی تیری شادی میں اڑا دی ہے؟ میں تجھے یہاں اپنی کوکھ میں نو مہینے اٹھائی پھری ہو۔۔۔۔۔ ابھی ہم مرے نہیں بیٹا۔۔۔۔ ہم مر جائیں اور بیوی تمہیں اجازت دے دے تو ہماری لاش لے جانا اس سے پہلے ہم نہیں آئیں گے۔ جا"۔[۱۰]

اوپر کا آخری جملہ "اس سے پہلے ہم نہیں آئیں گے" سے واضح ہو رہا ہے کہ وہ اپنی موت کے راستے بیٹے سے انتقام لے رہی ہے۔ دراصل وہ اپنی موت بلکہ خود کشی سے سماج کو دکھانا چاہتی تھی کہ کیسے ایک بیٹے نے زن مرید بن کر ماں کو گھر سے نکال دیا۔ وہ ماں جس نے اسے پالا پوسا، بڑا کیا، جس نے ہر طرح سے اس کی نگہداشت کی، جس کے قدموں تلے جنت ہے، کو گھر سے نکال کر موت کے بے رحم تھپیڑوں کے آگے بے سہارا چھوڑ دیا۔ اپنی خود کشی سے ایک طرف تو وہ انتقام کی زد میں بیٹے کو اپنے کئے پر نادم کرنا چاہتی ہے اور دوسری طرف سماج میں ماں کی مامتا کی قربانی کا شہرہ کرنا چاہتی ہے۔ اس نوع کی خود کشی کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

"ناکام عاشق ناشاد ہو کر اس جہاں سے رخصت ہونے کا فیصلہ کرتا ہے تو جہاں اس کے ذہن میں یہ احساس ہوتا ہے کہ میں قربان گاہ حسن پر نذرانہ زیست پیش کر کے اپنے بے وفا محبوب کو پشیماں کرو، وہاں لاشعوری طور پر اس کے ذہن میں یہ خیال بھی جاگزیں ہوتا ہے کہ اس کی قربانی کا ہر جگہ چرچا ہو گا"۔[۱۱]

نیکاں کی موت کو ایک اور زاویے سے دیکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے گھر سے نکلتے وقت خودکشی کا تہیہ کر لیا تھا۔ وہ اپنی ناراضی کسی بھی قیمت پر ختم ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ورنہ وہ ایک گھاک اور جہاندیدہ عورت تھی۔ اُسے علم تھا کہ اُس کا ناتواں جسم اور لاغر ہڈیاں گرمی سردی اور موسمی اثرات کی شدت نہیں سہہ سکتیں۔ اُسے علم تھا کہ گھر میں اُسے کھانا وقت پر ملے گا اور اچھا بھی ملے گا۔ اُسے علم تھا کہ اُسے اچھی رہائش، دیکھ بھال اور دوسرے احتیاطیں تدابیر کی اشد ضرورت ہے جو گھر میں رہ کر ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ اُسے علم تھا کہ اس بڑھاپے میں وہ اپنا ہر کام اور ہر ایک حاجت پوری نہیں کر سکتی۔ اُسے علم تھا کہ بیمار پڑنے پر بیٹا ہی اس کا علاج معالجہ کرے گا۔ اُسے علم تھا کہ اس کا شوہر محض مجبوری میں اس کا ساتھ دے رہا ہے، اپنی نہ سہی، شوہر کی بوڑھی ہڈیوں پر ہی احسان کر لیتی اور گھر چلی جاتی، وہ گھر جو اس کا اپنا تھا، بیٹے کا نہیں تھا۔ مگر نہیں، وہ شعوری طور پر گاؤں سے دور اُس کچے مکان میں ٹھہری رہی جہاں زندگی کی ضروریات اور آسائشیں موجود نہ تھیں۔ کیا کوئی ہوش مند انسان ایسے مقام پہ رہ سکتا ہے جہاں ضروریات زندگی کا فقدان ہو۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ نیکاں کا کھیتوں کے کچے مکان میں رہنے کا فیصلہ سراسر خودکشی کے مترادف تھا۔

حوالہ جات:

۱۔ ڈاکٹر روبیہ شاہین، سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد، شمارہ نمبر ۱۰۸ اکادمی ادبیات پاکستان، جنوری ۲۰۱۶ ص:۲۳۴

۲۔ ڈاکٹر سلیم اختر، افسانہ اور افسانہ نگار، تنقیدی مطالعہ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۱، ص:۱۷۸

۳۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ہماری جنسی اور جذباتی زندگی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۴، ص:۲۹

۴۔ ممتاز مفتی ، تلاش، الفیصل ناشران ۲۰۱۱ ، ص:۲۵,۲۶

۵۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ہماری جنسی اور جذباتی زندگی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۴، ص:۳۲

۶۔ احمد ندیم قاسمی، گھر سے گھر تک، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۵، ص:۱۱۴، ۱۱۳

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

۷۔ احمد ندیم قاسمی، گھر سے گھر تک، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۵، ص:۱۱۶، ۱۱۵
۸۔ ڈاکٹر صفیہ عباد، راگ رُت، خواہش مرگ اور تنہا پھول، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۶، ص:۴
۹۔ احمد ندیم قاسمی، گھر سے گھر تک، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۵،، ص:۱۱۸
۱۰۔ احمد ندیم قاسمی، گھر سے گھر تک، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۵، ص:۱۱۸
۱۱۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ہماری جنسی اور جذباتی زندگی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۴، ص:۱۸۰